پھاٹک کھولا، میر علی پھاٹک پیٹتے تھے اور چلاتے تھے "گر پڑی، گر پڑی"، بڑے ابا نے گھور کر پوچھا "کیا گر پڑی؟" وحشت میں جواب دیا "چھت" وہ دن اور آج کا دن کہ پھر کبھی چھت کے نیچے سونا نصیب نہ ہوا۔ کبھی چھت تلے لیٹتے تو بری طرح ڈکراتے چلاتے اور محلے والوں کی نیندوں میں خلل ڈالتے۔ دن نکلتا تو مردہ سے ہو جاتے، نہ ڈکرانا نہ بنکارنا نہ کسی سے بولنا، جھلنگے پہ بیٹھے گٹھری بنے اونگھتے رہتے۔ وہ اور تحسینہ بہت بہت دیر تک احاطے سے باہر کھڑے انہیں تکتے رہتے، ڈرتے حیران ہوتے، پھر آپ ہی آپ وہاں سے چل پڑتے اور ایک تھے گڈھے شاہ کہ بس تائی اماں نے انہیں دیکھا تھا۔ میر بو علی آنکھوں دیکھی حقیقت تھے، گڈھے شاہ تائی اماں سے سنا افسانہ۔ مجذوب تھے، حویلی کی دیوار تلے ڈیرہ ڈالا تھا، انگلیوں سے زمین کھودتے رہتے، کوئی پوچھتا تو جواب دیتے "فقیر رہنے کو گھر بناتا ہے"۔ گڑھا ذرا گہرا ہوا تو اندر اس کے بیٹھ گئے۔ ایک روز بڑے ابا پاس پہنچے، گزارش کی "شاہ جی حویلی حاضر ہے، اس میں ڈیرا کرو"۔ گڈھے شاہ بے اعتنائی سے بولے "حویلی زمین کے نیچے ہے"۔ بڑے ابا کو برا لگا، تڑخ کر جواب دیا "تو زمین کے نیچے ہی جاؤ اور رہو"۔ دوسرے دن نہ گڑھا تھا نہ گڈھے شاہ تھے۔

وہ اور تحسینہ سنتے اور حیران ہوتے۔ تائی اماں حیران ہوتیں، پھر معنی خیز انداز میں چپ ہو جاتیں۔ پھر چپ ٹوٹتی اور کہنے لگتیں "ہمارے ابا بہت بڑے عامل تھے۔ ہمارا تو پتا خاندان عاملوں کا خاندان ہے۔ آگے ہماری ہر پیڑھی میں ایک عامل ہوا کرتے تھے، پر بڑے ابا کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"کوئی گدی ان کی سنبھالنے والا جو نہ تھا۔ ابا میاں کے شغل شغال اور تھے، باپ کے علم پر کبھی توجہ ہی نہ کی، دوسروں کے پاس چلا گیا۔ کیا ہوا کہ جب بڑے ابا چارپائی پہ پڑے تو ایک ننگا فقیر جنیں کہاں سے آیا، حویلی کے سامنے دھونی دے دی۔ بڑے ابا کی حالت بگڑتی چلی گئی اور اب دم اب دم ہونے لگے۔ تین دن بری حالت رہی، سانس گلے میں اٹکا ہوا، وہ

کرب کہ اللہ توبہ۔ بی بی تیسرے دن کیا ہوا کہ وہ ننگ دھڑنگ سنڈ مسنڈ ملنگ گھر میں گھس آیا۔ عورتیں چلانے لگیں، پر بڑے ابا نے اشارہ کیا کہ آنے دو۔ سب دم بخود۔ اسے بی بی وہ بڑے ابا کے پاس جا سینے سے چپٹ گیا۔ بڑے ابا تھر تھر لئے اور..... ختم..... واپس چلا گیا۔ پھر ایسا غائب ہوا کہ لوگوں نے ڈھونڈیا ڈالی اور اس کا پتہ نہ چلا..... بس اس دن سے حویلی والوں میں کوئی عامل نہیں ہوا....."

خاندان کے بزرگوں کی یادیں اور باتیں، جن بھوتوں کے قصے، کبھی کہانی کوئی، تائی اماں کی داستان ہر رنگ جاری رہتی اور رات بھیگنے لگتی اور آنکھیں اس کی نیند سے پہلے بھاری ہوتیں پھر بند ہونے لگتیں۔ آنکھ پھر کھلتی تو سب سوئے ہوئے ہوتے، خاموشی، خراٹے، اندھیرا، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بو علی کی بنکار، دل ڈرے دھڑکتا اور دانت جاڑے سے بجنے لگتے: پھر پتہ چلتا کہ وہ تائی اماں کی چارپائی پہ نہیں بڑی آپا کے بستر میں ہے اور آہستہ آہستہ سرک کر وہ بالکل بڑی آپا کے پہلو میں ہو جاتا اور ان کے گداز اور محبت بھرے پہلو سے نکلتی گرمائی دھیرے دھیرے بھر اس پر بند بن کر چھانے لگتی۔ دوبارہ آنکھ اس کی کھلتی تو پھر وہی خاموشی اور خراٹے اور اندھیرا، کالے کوس آگے کالے کوس پیچھے، نگھی نہ ساتھی، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بو علی کی بھید بھری بنکار تک سنگت چھوڑ جاتی اور نیند بھی، وہ جاگتا رہتا اور رات لمبی ہوتی جاتی اور دم اس کا یہ الٹتا کہ بدن سے لحاف الٹ دیتا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنے لگتا، اتنے میں اچانک آواز اذان کی کان میں آتی کہ اس سے اندھیرے میں نور کی ایک لکیر کھنچتی دکھائی دیتی، اسے اطمینان ہوتا کہ رات اب آخر ہوئی۔ پھر لال مندر جاگتا، سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں بجنے لگتیں، اندھیرے میں روشنی کا ایک بھنور پیدا ہوتا، دھیرے دھیرے ابھرتا پھیلتا اور ڈوب جاتا۔ پھر وہی خاموشی، جانور رات ختم ہوتے ہوتے پھر شروع ہو چلی ہے اندھیرے میں پھر اس کا دم الٹنے لگتا کہ اتنے میں روئی کا پہلا بول اٹھتا، روئی کا ایک پیچ بولتا، پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوسرا پیچ، پھر آوازوں کا ایک تار بندھ جاتا گویا اندھیرے کی تہ پھٹ

گئی ہے اور روشنی کی دھار بہ نکلی ہے، کوئی جھوجری آواز، کوئی پتلی آواز جس میں کئی پلٹے آتے، اور ایک پیچ تھا کہ مثل ریل کے انجن کے تیزی سے سیٹی دیتا اور چپ ہو جاتا اور پھر اس سب سے موٹی اور بھاری والی آواز والے پیچ کی آواز، رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ بھاری اور یکساں آواز میں بولتا رہتا، بولتا رہتا، اور وہ سمجھتا کہ صبح تک یونہی بولتا رہے گا، مگر آہستہ آہستہ آواز ڈھلنے لگتی اور پھر وہی خاموشی۔ رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ سب سے آخری اعلان بھی تھا کہ بعد اس کے کوئی پیچ نہ بولتا اور دن میں دوپہروں کے سفر کی آخری منزل کہ وہاں پہنچ کے ٹھٹکتا اور اس سرخ اینٹوں والے موٹے مٹھس ستون کو کہ بلند ہوتے ہوتے آسمان کو چھوتا نظر آتا دیکھ کے حیران رہ جاتا۔ فضا میں بلندیوں کی یہ انتہا زمین پر ملک کی آخری سرحد تھی، جہاں سے آگے قدم رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ اب اجنبی ملک کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ اجنبی ملک کے علاقے کو وہ دور سے دیکھتا اور واپس ہو لیتا۔

جلتی دوپہریوں میں، ہوا بند ہو یا لوں چلتی ہو یا آندھی اٹھتی ہو کہ ستر بلائیں ساتھ لاتی، آوارہ گھومنا، گھومتے رہنا، کبھی پیڑوں کی چھاؤں میں کبھی گرم گرم بالو جیسی ریت پہ اور کبھی ہرے بھرے کھیت میں، اتنا چلنا اتنا چلنا کہ ٹانگیں دکھنے لگتیں اور تحسینہ کا گورا منہ سرخ ہو جاتا اور بالوں کی لٹیں پسینے سے تر بتر کنپٹی پہ اور گردن پہ آ کر چپک جاتیں۔ واپس جاتے ہوئے مندر والی گلی میں، مندر والی گلی سے پیاؤ کی گلی میں جہاں پانی پیتے منہ ہاتھ دھوتے اور پھر اپنی گلی میں۔ مندر والی گلی سے گزرتے ہوئے اس پہ ہیبت سی چھا جاتی۔ سرخ پتھروں والا مندر کہ دھوپ میں دور سے آگ دیتا۔ اس کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہا، اس کے اندر کون رہتا ہے، آدمی کہ جن: سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں کہ روز تڑکے میں اور شام پڑے پہ بجنے لگتی ہیں، کون بجاتا ہے: بہت اونچائی پہ چھوٹی سی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی چرخی کہ دوپہر میں شانت رہتی ہے اور دھوپ ڈھلنے لگتی ہے تو آپ ہی آپ گھومنے لگتی ہے اور سفید ڈوری میں بندھی ہوئی پیتل کی چمکتی دمکتی گڑوی نیچے ہوتے ہوتے کنوئیں کے اندھیرے میں چھن سے گرتی ہے جانو

کسی نے مٹھی بھر اشرفیاں پھینکی ہیں اور پھر غائب، پھر تھوڑی دیر میں پانی سے لبالب چمکتی دمکتی نکلتی ہے، اوپر ہوتی چلی جاتی ہے اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اچانک گم ہو جاتی ہے، گڑوی کون ڈالتا ہے کون کھینچتا ہے اور یہ اتنی لمبی ڈوری کہاں سے آئی، سوچ کی ڈوری لمبی ہوتی چلی جاتی، اتنی لمبی کہ ہاتھ سے سرا نکل جاتا، اتنے میں کوئی پیلی بھڑ من کے آس پاس کی کسی کچی گچی سے اٹھتی اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ سرخ پتھروں والی من تو دھوپ میں یہ تپتی کہ وہ پاؤں رکھتا تو جلنے لگتے، مگر آس پاس ننھی منی کچی گچیاں تھیں، جن میں پانی جمع رہتا اور جہاں کوئی اکیلی بھینسری پانی میں بیٹھے بغیر پانی پہ سائے کی طرح منڈلاتی رہتی، معلق پھرکنی بن کر گردش کرتی رہتی یا کوئی سنہری چتیوں کا لے ٹیکے والی انجنہاری کنارے پر اترتی، ڈنک کو گردش دیتی اور اڑ جاتی۔ ہاں پیاؤ کی گلی میں کہ مندر والی گلی سے آگے تھی۔ دوپہر بھر چھاؤں رہتی اور پیاؤ چلتا رہتا۔ دونوں پانی پیتے، پھر اس ٹھنڈی نالی میں کھڑے ہو جاتے جو یوں اجلی تھی پہ کاہی کی ہلکی تہہ جم جانے سے رپٹواں ہو گئی تھی۔ پیروں کے اوپر سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پھسل کر بہتا رہتا اور وہ کھڑے رہتے۔ ایک روز اسی طرح کھڑے کھڑے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ ایسا پھسلا کہ سارا گٹا چھل گیا۔ تحسینہ کھل کر ہنس پڑی۔ وہ روہانسا ہو گیا مگر پھر چپ ہو گیا۔ رستے بھر اسے تحسینہ پر سخت غصہ آتا رہا اور جب کھنڈال کے پیڑ پہ جا کر اس نے کھنڈال کی ایک ہری لچکتی ہوئی سنٹی توڑی تو اسے تحسینہ کو دینے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔

"خیر، ہمیں دے دے یہ سنٹی"، تحسینہ کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

"کیوں دے دوں؟" اس نے روکھا جواب دیا۔ "دے دے، ہم تجھے گھر چل کر نیلا شیشہ دیں گے" اس نے پھر بڑی خوشامد بھری آواز میں کہا۔

"بڑی دے گی شیشہ۔ جاؤ نہیں دیتے ہم۔"

تحسینہ ایک دم سے چپ ہو گئی، جیسے روٹھ گئی ہو۔ وہ خود پیڑ پر چڑھنے لگی۔ پیڑ پہ وہ اچھی خاصی چڑھ گئی تھی، لیکن وہ بار بار ٹوکتا۔ قدم ذرا ڈگمگایا اور اس نے شور مچایا "وہ گری"

پھر سنبھل جاتی۔ آخر وہ ایک موٹے سے کدے پہ پہنچ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور سنٹی توڑنے لگی۔ ہوا ہولے ہولے چلتی تھی، بار بار ذرا تیز سا جھونکا آتا اور سوکھے سنہری بال اس کے منہ پر آ پڑتے اور سفید ڈھیلا پائجامہ جو اس نے آج ہی بدلا تھا کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرنے لگتا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اس کی آنکھوں میں اور آنکھوں کے ساتھ ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ اس نے نیچے کھڑے کھڑے آواز لگائی "تحسینہ ننگی" سنٹی توڑتے توڑتے تحسینہ کے ہاتھ رک گئے۔ پاؤں اس کے اک ذرا کانپے، پھر وہ سنبھلی، اور آہستہ سے نیچے اتر آئی۔ زبان سے چپ، منہ سوجھا ہوا، تیوری تنی ہوئی، آنکھوں میں انگارے، وہ اسے دیکھ کے سہم گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اور وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا، ہاتھ پاؤں شل، دل اندر سے بیٹھا جائے۔ وہ اس کے بالکل پاس آ گئی اور اس کی ڈر کے مارے بری حالت مگر غصہ بھری آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل پڑے۔ تحسینہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر وہ مڑی اور ہچکیاں لیتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی۔

پاؤں سو سو من کے اور جی بیٹھا جائے۔ کنوئیں پہ بہت دیر بے سدھ کھڑا رہا۔ پانی سے بھری چرس اوپر آتی، ہیرا اسے زور لگاتے ہوئے اپنے پیروں کے قریب لاتا اور پوری آواز سے گاتا۔

ہو جی گنگا جمنا سرسوتی سات سمندھو بھرپور

سفید بے رنگ پانی اس کے پھٹے ہوئے سفید پیروں پہ بکھرتا، پھر کنڈی میں، کنڈی سے کچی گدلی نالی میں بہتا چلا جاتا۔ وہ کھڑا رہا کھڑا رہا، پھر آپ ہی آپ چل پڑا۔

گھر کے دروازے پہ پہنچ کے وہ ٹھٹکا۔ سوچ میں پڑ گیا، اس سوچ میں کہ اندر کیسے جائے۔ ڈرتے ڈرتے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، پھاٹک سے گزر کے دبے پاؤں دوبارہ میں پہنچا اور اندر کے دروازے کی دراڑ سے اندر جھانکنے لگا، نظر تو کچھ نہ آیا ہاں ابا میاں کے چلانے کی آواز کانوں میں آ رہی تھی، شاید تحسینہ نے ابا میاں سے کہہ دیا، اور اس کا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ جلدی سے باہر نکلا اور الٹے پاؤں گلی میں مندر کے پاس پہنچ کر اس

نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ کوئی آ رہا تھا۔ دل کو ڈھارس ہوئی اور قدم آہستہ پڑنے لگے۔ پانی کے ایک ننھے سے تھالے پر ایک بھنبیری جانے کب سے معلق پھرکنی سی گھومے جا رہی تھی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی مگر پنہارنیں کنوئیں پہ ابھی نہیں آئی تھیں۔ ہاں کھڑکی کی خاموش چرخی جاگ اٹھی تھی۔ چمکتی دمکتی گڑوی نیچے اترنے لگی ڈوری لمبی ہوتی گئی اور گڑوی نیچے اترتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کنوئیں کے اندر چھپاکا ہوا، اور لمبی ڈوری سمٹنے لگی، کھڑکی کے اندھیرے میں گم ہونے لگی اور پھر وہ سفید چمکتے موتی برساتی سونے سی گڑوی بھی اندھیری کھڑکی میں گم ہو گئی۔ اس کی حیرت پھر جاگنے لگی تھی۔ خاموش چرخی کو وہ دیر تک تکتا رہا، اس بھید بھری کھڑکی کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک بار نے اس کا دھیان بھٹکایا جو اس کے ہاتھ کے جھٹکے سے پرے ہٹ گئی اور پھر اسی پانی کے ننھے منے تھالے پہ جا بیٹھی جہاں کئی پیلی پیلی تریں اور بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کے اسے اپنی کھنڈال کی قچی یاد آ گئی جسے وہ وہیں کھنڈال کے درخت کے نیچے پھینک آیا تھا اور جو اس وقت ہوتی تو ان ساری تریوں کو سگھو الیتا۔ اسے پھر ساری بات یاد آ گئی اور جی ڈھیلنے لگا وہ اداس اداس پھر چلنے لگا۔ پیاؤ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پیاس لگنے لگی۔ اوک سے پانی پیا کہ کھاری تو نہیں پھیکا پھیکا ضرور لگا اور شاید ایسا ٹھنڈا بھی نہیں تھا۔ پیاس بجھ کر بھی بنے بجھی رہی۔ پیاؤ کی گلی سے سڑک پہ چلا آیا جہاں دھوپ ڈھلنے پہ کئی چاٹ والے آ بیٹھے تھے۔ ایک میلا کھٹا کتا اس طرف بھوکی نظریں جمائے کھڑا تھا کہ کوئی گاہک دہی بڑے کھا کے پتا پھینکتا تو لپک کے آتا اور چاٹنا شروع کر دیتا۔

بازار کی جن جانی بوجھی دکانوں پر وہ گھنٹوں بے مقصد دیر دیر تک شوق سے کھڑا رہتا اور کبھی دس سروں والے راون کی تصویر اور کبھی دہڑ دہڑ جلتی ہوئی لنکا کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہنومان جی کی تصویر کو تکتا رہتا اور کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا کہ یہ کالا سانپ کہ گردن میں البیٹ دیے سر پہ پھن پھلائے کھڑا ہے۔ شو جی کے پھنکار کیوں نہیں مارتا، ان میں سے ہر دکان پہ گیا، کھڑا ہوا، کھڑا رہا اور بے زار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ آخر دکانوں کے چراغوں میں بتی پڑی،

لیمپ اور لالٹینیں جلنے لگیں اور وہ پھر گھر کی طرف چلنے لگا۔

"کون؟ ضمیر؟ اندھیرے میں کھڑا ہے؟ کیوں، کہاں تھا اب تک؟"

سینے میں امنڈتا ہوا غبار گلے اور آنکھوں کی راہ امنڈ پڑا اور ابا میاں سارا غصہ بھول بھال سینے سے لگا اسے اندر لے گئے۔

ابا میاں اُسے یاد تھے، ابا میاں کی باتیں یاد تھیں، اگرچہ بکھری بکھری سی، انمل بے جوڑ انداز میں، چوڑا چکلا ڈھلتا ہوا جھریوں دار گورا گورا بدن، سفید ہلکی ہلکی ڈاڑھی، سر پہ بگلا سے بال، کمر قدرے جھکی ہوئی، بر میں اُجلا سفید ململ کا کرتا گلے میں لٹکی ہوئی چاندی کی ننھی سی تلوار جس سے دونوں وقت کھانے کے بعد خلال کرتے۔ حقہ پیتے پیتے اونگھنے لگے ہیں۔ حقے کی نے ہونٹوں سے الگ کی، چاندنی بچھے تخت پہ سجے ہوئے گاؤ تکیے پہ کمر نیچے کو کھسکی اور سفید برف سر ٹک گیا، خراٹے لینے لگے۔ ابھی خراٹے لے رہے ہیں اور ابھی خراٹے لیتے لیتے چونکے ہیں اور ظہر کی نماز کے لئے سیدھے مسجد کو۔ محراب پہ قرینے سے اوپر نیچے چنی ہوئی سرخ اور سرمئی چلمیں کہ بعض شوق سے خریدی گئی تھیں اور بعض تحفے میں آئیں اور کسی پہ سنہری کسی پہ روپہلی باریک نفیس جالی کھدی ہوئی، بھاری جھالر والا پنکھا کہ اونچی ڈاٹ والی چھت کے کندوں میں آویزاں دوپہری بھر حرکت میں رہتا اور بیٹھک کے گوشے گوشے میں ہوا پہنچاتا، پیتل کا چمکتا ہوا اگالدان، کونے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی چھڑی، لمبا چوڑا تخت کہ چاندنی اس پر بچھی تھی۔ چاندنی پہ قالین اور گاؤ تکیہ۔ ابا میاں سارا دن اسی تخت پر بیٹھے رہتے، آنے والے آتے، مونڈھوں پہ بیٹھتے، حقے پیتے، پان کھاتے، باتیں کرتے، اور چلے جاتے۔ بیٹھک پھر خالی رہ جاتی اور ابا میاں اونگھنے لگتے "ضمیر، تحسینہ کہاں ہو" وہ اور تحسینہ دونوں بھاگے بھاگے آتے اور ابا میاں سے لپٹ جاتے، روزانہ جو دیتے تھے وہ۔ مگر دوپہر کو ان کی پکار گرفتاری کا پیام بن کر آتی "باہر لو چل رہی ہے، سو جاؤ"، ایک بغل میں تحسینہ دوسری بغل میں وہ، بیچ میں، بامیاں، انہوں نے خراٹے لینے شروع کئے اور تحسینہ نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اس نے تحسینہ کو بھیرے

سے اُٹھے کہ اتنے میں خراٹوں کا تسلسل ٹوٹتا "کہاں جاتے ہو، لیٹے رہو۔" اور وہ دونوں پھر دم سادھ کر آنکھیں میچ کر لیٹ جاتے، لیٹے رہتے لیٹے رہتے کہ اتنے میں گلی میں ملائی کے برف والا گھنٹی بجاتا، ملائی کا بریف، کی صدا لگاتا آتا اور وہ بے اختیار ابا میاں کے پاس سے اٹھ لپکتے دوڑنے لگی پاس پہنچتے۔ اپنی اپنی اکنی نیفے سے نکال، ملائی کا برف خریدنا کہ چاقو سے کٹی ہوئی سفید برف قاشیں ہرے ہرے پتوں پہ جمتی چلی جاتیں اور پھر ان کی انگلیوں کے مس سے پگھلتی چلی جاتیں برف جب ختم ہو جاتا تو انگلیوں کا واسطہ ختم ہو جاتا اور برف سے سنے پتے اور زبان میں بے واسطہ رشتہ پیدا ہو جاتا۔ پھر گیلی انگلیوں کو دامن سے پونچھتے اور ابا میاں کے خیال سے ڈرتے سہمتے ہولے ہولے اندر آتے، اتنے میں دالان کے کسی در سے بڑیا آہستہ سے نکل کر رینگتی ہوئی اوپر اُٹھتی نظر آتی "بڑیا"، اور دونوں کے دونوں تیر کی طرح زینے میں ہو چھت پہ پہنچتے۔ تحسینہ بڑیا پکڑ لیتی اور منڈیر پہ کھڑے ہو، بڑیا کو چٹکی میں پکڑ فضا میں بلند کرتے ہوئے پیغام دیتی "بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا سلام کہیو" "اور میرا بھی" وہ بے تابی سے بول اُٹھتا۔

"نہیں کیوں، بڑیا میری ہے۔ بڑیا بڑیا اللہ میاں سے تحسینہ کا سلام کہیو" اور چٹکی کھلتی، اور بڑیا، سفید گالا جھالا، ہوا کے جھونکے کے ساتھ اوپر اُٹھتی اور اونچی چلی جاتی۔ وہ روہانسا ہو جاتا اور تحسینہ سے اس کا دل بھر جاتا۔ اداس اداس ساری چھت پہ بھٹکتا پھرتا کبھی اس منڈیر کے پاس کبھی اُس ممٹی کے قریب، کبھی سوکھی مرنڈ گھاس والے بوسیدہ چھجے پہ کبھی اس بڑے کھڑے پہ جس کے راستے برسات کے دنوں میں چھت کا سارا پانی سمٹ کر دیوار سے نکلے ہوئے ٹین کے ٹوٹے پیت نالے میں جاتا اور دھاڑ دھاڑ گلی میں گرتا اور مایوس ہو کر وہ نیچے اترنے لگتا، اتنے میں بندروں کے طفیل ٹوٹی ہوئی ممٹی میں ایک ننھی سی بڑیا دبکی نظر آتی "بڑیا مل گئی" وہ زور سے چلاتا۔ پھر وہ بھی اسی منڈیر پہ کھڑا ہو پیغام دیتا "بڑیا میرا سلام اللہ میاں سے کہیو" تحسینہ کس حسرت سے بڑیا کو دیکھتی، بڑیا کہ اس کی چٹکی سے نکل دھوپ سے پلتی فضا میں تیرنے لگتی، رینگتی رہتی رینگتی رہتی اور تحسینہ لہک کر کہتی "تیری بڑیا تھکی ہوئی ہے۔ اللہ میاں

کے پاس کیسے پہنچے گی۔ لو جی وہ تو نیچے آرہی ہے،، وہ پھر رونا سا ہو جاتا کہ اتنے میں ہوا کا ایک دور کا جھونکا آتا اور بڑیا نیچے آتے آتے اٹھتی اور تیزی سے بلندیوں پہ بہتی چلی جاتی۔ اللہ میاں کو سلام لے جانے کے سوال پہ ان میں ہمیشہ لڑائی ہوتی، بڑیا تو ایک ہی کا سلام لے جا سکتی تھی نا، اور تحیینہ ایسی مطلبی کہ بس اپنا سلام اللہ میاں کو بھیجتی۔ ہاں سینگی بائی کی جادو بھری آواز دور سے آتی تو دل ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتے اور سہمی آنکھیں آپس میں ایک ہی کہانی کہتیں۔ مارے ڈر کے نیچے منڈیر کے، دیوار سے زینے کی لگے دبکے دبکائے بیٹھے رہتے اور اتنے پاس پاس ہو جاتے کہ دھڑکن ایک دوسرے کے دل کی صاف سنائی دیتی بیٹھے رہتے بیٹھے رہتے، پھر چپکے چپکے سر نکال کر گلی میں جھانکتے کہ سینگی بائی ہے یا گھر چلی گئی۔ "بڑیا" گلی میں بھٹکتی ہوئی بڑیا کو دیکھ کے یک بارگی چونکنا اور سینگی بائی کو بھول بھال موافق تیر کے زن سے زینے سے نکل آنگن میں، آنگن سے گلی میں۔ پر بڑیا غائب کہاں گئی، چھو ہو گئی اور وہ بڑیوں کی تلاش میں ایک لمبے اور خطرناک سفر پہ چل کھڑے ہوتے، بھونڑ کی طرف، جہاں آکھ کے پودے کھڑے تھے کہ ان کے ہرے کچے کچے پھلوں کو توڑنے پہ سفید سفید دودھ نکلتا اور جب پک کر آپ پھٹتے تو اندر ان کے باریک سفید ریشم کے تار سے تنے ہوتے: چٹیل میدان کہ چلتے چلتے کوئی کنبشہ تلوے میں چبھ جاتا اور خون نکلنے لگتا یا گوکھرو چبھ جاتے اور نکالے نہ نکلتے، کہیں بدرنگ کانٹے دار جھاڑی، کوئی آڑا ترچھا اکیلا ببول کا پیڑ، کالی چتی دار سرخ دانوں والی جھاڑیاں اور پرے ان کے ایک طرف کھنڈال کا ایک ہرا بھرا پیڑ ایک اونچا پیپل اور کئی ایک گھنے نیم یہ گتھے ہوئے کہ نیچے ان کے دھوپ کا نشان تک نہ ہوتا ان درختوں کے قریب پہنچنے پر سفر کی منزل اکثر بدلی ہے اور بڑیوں سے ذہن گرگٹ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ ان درختوں میں جانے کتنے گرگٹ چھپے تھے کہ دوپہری میں روز ایک آدھ گرگٹ کا بھرتا ہوتا اور دوسرے دن آتے تو پھر نیم کے کسی گدے پر کھنڈال کی کسی ٹہنی میں کبھی سرخ سرخ منہ نظر آتا کبھی پیلی پیلی لمبی دم کھنڈال کی لمبی لچکیلی ہری سنٹیوں سے اور اینٹوں سے گرگٹ مار کے حضرت عباس کی مشک میں چھید کرنے کا

بدلہ لینا اور ایک ایک بل خول بڑھانا اور پھر اس سے پرے چلتے ہوئے کنوئیں پہ ہاتھ منہ دھونا چلو بھر بھر پانی پینا اور کنڈی کے ٹھنڈے موتیا پانی میں پیڑوال دینا۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی کالی چرس جب کنارے پہ آجاتی تو گورا چٹا کڑیل جوان ہیرا رسے کو زور سے کھینچتا اور تان لگاتا۔

ہو جی گنگا جمنا سرسوتی سات سندھو رہو بھر پور

اور اس کے قدموں میں ان گنت ٹھنڈے اُجلے سیال پھول بکھر جاتے۔ کالے گھٹنوں سے اونچی میلی دھوتی اور مونٹوں سے نیچے تک لٹکتی ہوئی گچھا سی کھچڑی مونچھوں والا گندل بیلوں کا رسہ کھولتا، "تیرا بیل کا منہ ہو"، اور اس کے ساتھ ہنٹر پڑنے کی سڑاک سی آواز جس کے اثر سے اڑے ہوئے بیل پھر اونچائی کی طرف چل پڑتے اور اس تیزی سے کھر مارتے خاک اڑاتے کہ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے رستے سے ہٹے اور اس کے سر پر آئے اور وہاں سے ہٹ کر پھر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف ہو لیتے۔ پھر وہی معرکہ۔ گرگٹ۔ گرگٹ سے وہ ڈرتا بھی تھا اور دکھائی دے جاتا تو مارے بغیر چھوڑتا بھی نہیں تھا، پلی بھر خون جو گھٹ جاتا۔ ہاں ایک دفعہ وہ گرگٹ کو نہیں مار سکا تھا، بس ایک دفعہ، مارنا کیا معنی ہاتھ ہی نہیں اٹھا۔

"گرگٹ"، اس کی آستین پہ تحسینہ کی گرفت سخت ہو گئی اور دونوں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پیپل کی جڑ سے نکل کے وہ تنے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے اینٹ اٹھائی، اینٹ اٹھائی تھی کہ وہ چڑھتے چڑھتے ایک دم سے رُک گیا: منہ اس کا تنے سے کوئی ایک انگل اونچا اٹھ گیا اور سُرخ ہوتے انگارے کی مانند دہکنے لگا۔ سرخی اس کی گردن میں، اس کی پیٹھ میں لہریں لینے لگی اور پھول کے وہ پہلے سے دگنا موٹا ہو گیا۔ تحسینہ کی مٹھی نے اس کی آستین کے ساتھ ساتھ اس کا بازو بھی انگلیوں میں جکڑ لیا۔ دونوں دل ایک آہنگ، ایک رفتار سے دھڑکنے لگے: دونوں ایک بن گئے: اکیلے، کوسوں آدمی نہ آدم زاد، نہ آدم زاد کی آواز، پانی کی بھری چرس کنوئیں میں معلق اور بیل، ڈھلان پہ اترتے اترتے دفعتاً رک گئے تھے اور ہیرا اور گندل کنواں چھوڑ کر کہیں گم ہو گئے تھے۔ ہر چیز ہر آواز ٹھہر گئی تھی، قدم ان کے دھڑکتے ہوئے دل ان کے،

ہاتھ میں اٹھائی ہوئی اینٹ، پیپل کے کُدے کھنڈال کی لمبی لچکیلی شاخیں۔ ایک چیز بس حرکت میں تھی، حرکت میں تھی، لہرا رہی تھی، سرخی کہ اب بل کھا کے ہری پڑتی جا رہی تھی، اینٹتی بل کھاتی ہری لہر، گرگٹ جانو گم ہو گیا تھا کہ گھل گیا تھا اور رنگ کی لہر بن گیا تھا، پیچ کھاتی گرم ہوتی ہری لہر۔ لہر پھر بدلی، رنگ نے تیسری جون لی، ہری لہر نیلی پڑنے لگی: پھر گنتی کا احساس بھی جاتا رہا، کچھ خبر نہ تھی کہ کب سے کھڑے ہیں کب تک کھڑے رہیں، رنگ کون کون سی جون لے چکا ہے اور کون سی جون اور لے گا۔

چونکے تو پیپل کے پتوں میں ایک لمبی پیلی دم گھومتی ہوئی گم ہو رہی تھی۔ دم میں دم آیا اور دل پھر حرکت کرنے لگے، دھڑکنے لگے، اور پسینے کی تلی چلنے لگی۔ قدم کہ جم گئے تھے اور آپ ہی آپ کنوئیں کی طرف اُٹھنے لگے، جہاں چرس اپنے معمول سے چل رہی تھی اور ٹھنڈا نکھرے ہوئے موتیوں جیسا پانی ہیرا کے سفید پیروں پہ بہتا ہوا پختہ کنڈی میں، پختہ کنڈی سے کچی نالی میں، اور نالی سے کھیتوں میں جا رہا تھا۔ خاموشی سے پانی پیا اور جلدی سے گھر کی طرف چل پڑے، چپ چاپ، گم سُم۔ دہشت آنکھوں میں باقی تھی اور دھڑکنا دلوں نے ابھی بند نہیں کیا تھا۔ ہوا بند، اور بکوہ اور آکھ کی جھاڑیاں کہ جیسے دھوپ میں پگھلنے لگی ہیں۔ زمین نے قدم ایک دم سے پھر پکڑ لئے۔ چار قدم آگے ایک چکر تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ "چڑیل" تحسینہ نے آستین اس کی پھر جکڑ لی۔ چکر تیزی سے گھومتا گھومتا پھیلنے لگا اور آس پاس پڑے ہوئے کاغذ، پتنگوں کی ٹوٹی کمانیاں، مرغیوں اور کبوتروں کے اکا دکا میلے پر، چھوٹی چھوٹی کنکریاں اپنی لپیٹ میں لیتا آگے بڑھنے لگا، پیچ کھاتا اوپر اُٹھنے لگا۔

واپس گھر پہنچے تو بڑی آپا نے آڑے ہاتھوں لیا "کہاں گئے تھے تم؟ ذرا صورت دیکھو، منہ سُرخ ہو رہا ہے۔ ڈوبے لوؤں میں مارے مارے پھرے ہیں۔"

بڑی آپا چلاتی رہیں اور وہ دونوں کے دونوں چُپ۔ بڑی آپا کہنے کو پھوپھی، اصل میں ماں سے زیادہ۔ تحسینہ بیٹی تھی، پر بیٹی سے زیادہ اسے چاہتی تھیں۔ نہلانا دھلانا، رات کو

پاس سلانا۔ باوا جب اسے ساتھ لے جانے لگے تو روٹھیں، خفا ہوئیں، منتیں کیں، امی کو برا بھلا کہا، پھر کچھ نہ چلی تو روئیں۔ باوا بات کے ایسے پکے نکلے کہ نہ ابامیاں کی بات پہ دھیان دیا نہ بڑی آپا کے آنسو پہ پسیجے۔

"ہاں بھیا، تمہاری اولاد ہے تمہیں اختیار ہے۔ بیوی نے کہا ہوگا کہ لونڈا پھوپھی کے پاس رہ کر بگڑ جاوے گا، لے کے آؤ۔ ہاں بھیا شوق سے لے جاؤ۔ ہم کون روکنے والے"

بڑی آپا تانتی رہیں، باوا سنتے رہے، مگر ارادے میں ذرا فرق نہ آیا۔ باوا کرتے وہی تھے جو جی میں آتی تھی مگر سنتے تھے خاموشی سے۔ ابامیاں کے سامنے تو بالکل ہی چپ رہتے انہیں دنوں کی ایک تصویر اب تک حافظہ میں اس کے محفوظ تھی۔ صبح ہی صبح بیٹھک میں لوگ جمع تھے اور ابامیاں کی آواز بار بار غصے سے کانپنے لگتی اور منہ سرخ پڑ جاتا۔ اتنی سویرے لوگوں کا بیٹھک میں جمع ہونا بھی عجیب سا تھا۔ کیونکہ ابامیاں اتنی سویرے نہ تو بیٹھک کھولتے تھے اور نہ ملنے والے آتے تھے ہوا رات سے بند تھی۔ رات کو گرمی سے کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی اور دیکھا کہ بڑی آپا جاگتی ہیں اور پنکھا جھلتی ہیں۔ صبح پھر بہت سویرے گرمی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ سارا آنگن پیلا پیلا ہو رہا تھا۔ ایک غبار دیواروں پہ، منڈیروں پہ، چھت پہ نیم کے اوپر غرض سب جگہ تیر رہا تھا، تیرتے تیرتے رک گیا تھا۔ بڑی آپا نماز کی چوکی پہ تھیں اور اپنی میٹھی دکھ بھری آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں۔

مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

صبح کی نماز کے بعد یہ مناجات بڑی آپا کا ورد تھا۔ روز یہی ہوتا کہ آنکھیں اس کی ابھی بند ہیں اور آدھے سوتے اور آدھے جاگنے کی کیفیت ہے اور کانوں میں چاندی کی کٹوریاں سی بج رہی ہیں۔

مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی

بڑی آپا کی آواز میں عجب رقت اور درد کی کیفیت تھی اور مناجات پڑھتے دیکھ کر لگتا

کریں ابھی پکھلیں کی اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں گھل جائیں گی۔ پیلا پیلا آنگن، ہوا بند، اور بڑی آپا کی رقت بھری میٹھی آواز ایک ٹھنڈی منور مکبر آنگن کی پیلی گرم فضا میں رستہ بناتی ہوئی اس کی آنکھیں پھر مندنے لگیں، لیکن بند ہوا سونے کہاں دیتی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ بڑی آپا مناجات پڑھتی تھیں، تائی اماں وضو کر رہی تھیں، تحسینہ بے سدھ پڑی خراٹے لیتی تھی اور بیٹھک سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے اسے اکتاہٹ ہوئی۔ آنکھیں ملتا چارپائی سے اترا اور سیدھا بیٹھک میں۔

"سن رہے ہو، بنیاد علی، پیر جی کی باتیں" ابا میاں زور زور سے بول رہے تھے۔ اماں پیر جی تم مجھے جھوٹا ڈال سکتے ہو مگر اخبار کو کیا کرو گے۔ فائل نکلواؤں اور دکھاؤں آپ کو اخبار

اخبار کے ذکر پر پیر جی تھوڑے سے سٹپٹائے اور بنیاد علی پہ ابا میاں کی بات کا سکہ جم گیا۔

ابا میاں اور تیز ہوئے "یہ انتہا تھوڑا ہی ہے اور سنیے۔" ابا میاں رکے اور پیر جی سے آواز اونچی کر کے بولے "پیر جی اور سنیے، حضور رسولِ مقبول کے روضے کا بھی قبہ گرا دیا۔"

"قبہ گرا دیا" بنیاد علی، مولوی ثناء اللہ شیخ ضیاء الحق سب کے بدن میں رعشہ آ گیا۔

"نہیں صاحب، خیال میں آنے والی بات نہیں۔"

"نہیں صاحب" ابا میاں گرجے "تو اخبار تو مان لو کہ جھوٹا ہوا نا؟"

سب کے سب چپ ہو گئے۔

پیر جی بولے "گرایا تو نہیں ہے اتروا کے الگ رکھ دیا ہے۔"

ابا میاں بولے "تو ہوا کیا کہ عین دوپہر میں ایک بدلی اٹھی۔ سارا مدینہ خشک، اور روضہ منورہ پہ چھم چھم پانی برسا کہ گنبد شریف اور صحن اقدس دھل کے گرد سے پاک ہو گئے۔"

عقیدت سے سب کے سر جھک گئے۔ پیر جی خاموش۔ مولوی ثناء اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ باوا الگ مونڈھے پہ چپ چاپ بیٹھے تھے وہ کل ہی چھٹی پر آئے تھے

بیچ میں موجود لیکن نہ کسی بات کی حمایت، نہ مخالفت اور نہ چہرے پہ غصہ نہ عقیدت۔ اپنی اپنی عادت باوا ابامیاں کے برعکس تھے۔

ابامیاں حقہ پیتے رہے، پھر حقے کو بنیاد علی کی طرف سرکا دیا۔ "شیخ جی تم منصفی کرو۔" وہ پھر بولے "ایسا شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہے؟"

شیخ ضیاء الحق فوراً بولے "توبہ کرو، ایسا شخص اور مسلمان"

"ایسا شخص مسلمان تو نہ ہوا نا؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔"

"اور جو ایسے شخص کی حمایت کرے وہ مسلمان ہوگا؟"

"ہرگز نہیں"

"تو اب سنو" ابامیاں بولے "تمہارے حضرت رئیس الاحرار نے اسی ابن سعود کی حمایت کی تھی۔"

"ابن سعود کی؟"

"واللہ ابن سعود کی۔ جو جھوٹ بولتا ہو وہ کافر۔ اخبار موجود ہے۔ اس میں ان کے قلم کی تحریر دی ہوئی ہے۔"

پیر جی پھر بولے "رئیس الاحرار کی دلیل یہ تھی....."

اب مولوی ثناء اللہ بولے "یہ تو مذہب کی بات ہوئی۔ سیاست کے بارے میں جو ان کی رائے تھی اس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔"

"لیجیے صاحب" ابامیاں طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بنیاد علی کی طرف مخاطب ہوئے "بنیاد علی سنتے ہو کیا کہہ رہے ہیں شیخ جی..... اماں شیخ جی آپ ہیں کانگریسی۔ میرا تو روئے سخن ان چار مسلمانوں کی طرف ہے۔"

بنیاد علی نے حقہ پھر ابامیاں کی طرف بڑھا دیا۔ ابامیاں نے حقے کے نے ہونٹوں میں لی۔

دو تین گھونٹ لئے، کھانسنا شروع کر دیا، پھر گھونٹ لئے اور آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"خیر جیسا کیا وہ ان کے ساتھ۔ اب وہ اس دنیا سے اُٹھ گئے اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔" بنیاد علی ٹھنڈا سانس بھر کے بولے۔

ابا میاں کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں اور حقہ بدستور گڑ گڑ کر رہا تھا۔

"ویسے یہ خبر صحیح بھی ہے؟" مولوی ثناء اللہ نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"صاحب سُنا ہے اللہ جانے" بنیاد علی نے جواب دیا۔

"اخبار میں تو ابھی کچھ آیا نہیں ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے" پیر جی بولے۔

ابا میاں کھنکارے، حقے کی نَے کو الگ کیا، کہنے لگے "آج کی خبر ہے تو اخباریاں کل ہوں گا۔" انہوں نے حقے کی نَے پھر منہ میں لے لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"خدا کرے جھوٹ ہو۔" شیخ ضیاء الحق بولے۔ باہر سڑک پہ اک دبا دبا سا ہنگامہ پیدا ہوا اور بہت سے قدموں کی مدھم چاپ۔

"کیوں بھئی کیسا جلوس ہے یہ؟" ایک شخص چلتے چلتے بیچ سڑک پہ ٹھٹک گیا۔

"جلوس؟" بیٹھک میں سب کے سب چونک پڑے۔ جلوس چلتے چلتے بیٹھک کے سامنے آگیا۔ کالا علم آگے آگے، پیچھے ایک مجمع، کھدر پوش کانگریسی رضاکار، ترکی ٹوپی اور شیروانیاں پہنے ہوئے مسلمان شرفاء۔ شیخ ضیاء الحق، پیر جی، بنیاد علی، مولوی ثناء اللہ سب کے سب اندر سے باہر چبوترے پہ آئے، پھر نیچے اتر کے جلوس میں شامل ہو گئے۔

ابا میاں آہستہ سے اُٹھے اور چبوترے پہ آکھڑے ہوئے۔ باوا ان کے پیچھے پیچھے۔ جلوس جب بیٹھک کے آگے سے گزر گیا تو ابا میاں کے قدم شاید بے ارادہ اُٹھے اور آہستہ سے نیچے اتر کر وہ بھی جلوس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ باوا ان کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ساتھ لگ لیا تھا۔

فقیر چند پرچونیا سودا تولتے دکان سے اٹھا اور نیچے آکھڑا ہوا "میاں کیا ہوا۔"

"مولانا محمد علی۔۔۔"

"محمد علی شوکت علی؟"

"ہاں محمد علی شوکت علی۔ لالہ جی دکان بند کر دو۔"

"لالہ جی، کیا ہوا، گھٹنا ہو گئی؟"

"ہمیے" محمد علی شوکت علی کا دیہانت ہو گیا۔" فقیر چند نے دکان کو تالا لگایا اور لپک جھپک آگے بڑھ جلوس میں مل گیا۔

"محمد علی شوکت علی خلافت والے؟"

"کیا کہا؟ خلافت والے محمد علی شوکت علی گزر گئے؟"

دکانیں بند ہونے لگیں۔ کسی نے دکان بند کر تھڑے پہ بیٹھ جانا مناسب جانا، کوئی جلوس میں جا ملا۔ خاموش جلوس سڑکوں اور گلیوں سے نکلتا ہوا ٹھٹھیروں والی گلی میں پہنچا، وہاں سے نکل کر بڑے بازار میں، بازار پینٹھ کے میدان میں آیا اور رک گیا۔

"حضرات بیٹھ جایئے" ایک شخص بلند آواز سے بولا۔ اور مجمع بڑی خاموشی سے میدان میں بچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر صمد آگے بڑھا اور چادر بچھے ہوئے تخت پہ جا پہنچا۔ کانگریس کے ہر جلوس میں صمد کھدر کا لمبا کرتہ پہنے عینک لگائے بال بڑھائے آگے آگے ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کئی مہینوں کے لئے غائب ہو جاتا اور جلوس میں بالکل دکھائی نہ دیتا، پتہ چلتا کہ جیل چلا گیا اور پھر کسی دن یکایک جلوس میں سب سے آگے جھنڈا لئے نظر آتا اور زور زور سے نعرے لگاتا، گلا پھاڑ کے تقریر کرتا۔ آج اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا تھا۔ وہ تخت پہ کھڑا ہوا۔ مجمع خاموش تھا۔ چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا، پھر بلند آواز سے بولا "بھائیو، ہم وطنو، آج رئیس الاحرار۔۔۔" اس کی آواز بھر آگئی۔ چپ ہوا۔ گلا صاف کیا، پھر بولا "بھائیو، آج۔۔۔۔۔" آواز پھر بھرانے لگی، پھر خاموش ہو گیا۔ مجمع بدستور خاموش تھا۔ بہت سے لوگ اس کی طرف تک رہے تھے۔ بہت

سوں کے سر جھک گئے تھے۔ بعض لوگوں نے چپکے چپکے رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک شخص نے پانی کا گلاس صمد کو پکڑا دیا۔ صمد نے پانی پیا، رومال سے منہ پونچھا، پھر اعتماد سے کھنکار کر بولا "ہم وطنو رئیس الاحرار نے فرمایا تھا کہ میں آزادی لئے بغیر اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گا۔" صمد چپ ہوا، پھر ایک ساتھ رقت بھری آواز میں چلا کر بولا "تو مسلمانو رئیس الاحرار واپس نہیں آئے۔ وہ ہمیں..... ہمیں وہ چھوڑ گئے" صمد کی آواز بھرا گئی اور وہ سٹیج سے نیچے اتر گیا۔

مجمع اسی طرح جما بیٹھا تھا، خاموش، سر جھکے ہوئے، کسی کسی آنکھ سے آنسو بہتے ہوئے اس نے ابا میاں کو دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ باوا چپ کھڑے تھے۔

(۲)

ماضی اس کے تئیں خوشبو تھی کہ اُڑ رہی تھی، حیرت کر رہی تھی لمبی راتوں اور کھڑی دوپہریوں کا وہ بے انت سلسلہ اب ایک ادھ بسرا خواب تھا۔ آنگن والا نیم کا پیڑ، اونچی نیچی لمبی چوڑی چھتیں، کاہی جمی منڈیریں اور اونچی دیواریں، سب سے اونچے کوٹھے والی وہ منڈیر جسے بندروں نے آدھا توڑ ڈالا تھا، پرے نظر آتا ہوا لال مندر، لال مندر سے بہت پرے کھڑا ہوا موٹا مٹھس پیچ، بیچ بیچ میں نیم اور پیپل اور شیشم کے درخت کھڑے ہوئے، سب چیزیں ویسے ہی ہوتے ہوئے ویسے ہی نہیں تھیں۔ اس سے وہ سب کی سب کتنی دور ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ دوسرے جنم میں اُن سے مل رہا ہے۔ سالوں بعد وہ واپس آیا تھا۔ کیا خبر ہے کہ ابھی اور کب تک وہ واپس نہ آتا، مگر ابا میاں کی بیماری کا تار پہنچا اور باوا نے جلدی جلدی چھٹی لی، امی نے سفر کا سامان تیار کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ مگر سفر گھنٹوں کا تو نہیں تھا، دنوں کا تھا۔ صوبے سے صوبے میں یوں تو نہیں پہنچ جاتے۔ گاڑی دن بھر چلتی۔ رات بھر چلتی، چلتے چلتے کھڑی ہو جاتی، پھر چلنے لگتی۔ رات کے اندھیرے میں کبھی کسی سٹیشن کے قریب کبھی بیچ جنگل میں

سیٹی ہو جاتی اور سیٹی دینے لگتی، کبھی کبھی اتنی کھڑی ہوتی کہ مسافر اکتا کر گاڑی کے نیچے اتر پڑتے اور لڑکیوں کی ٹولیاں پٹریوں کے بیچ میں بچھے کنکروں کو روندتی ہوئی چہل قدمی کرنے لگتیں۔ باوا پہلو بدلتے، کھڑکی سے جھانک کے دیکھتے اور بالآخر نیچے اتر کر کسی چپکر سے پوچھ گچھ کرنے لگتے کہ اتنے میں دور پٹری پہ روشنی کا ایک ہنڈا دکھائی دیتا، جو قریب آنے پر اتنا تیز ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے، مگر جب مسافروں سے بھرے ہوئے روشن ڈبے ساکن ڈبوں کے برابر سے تیزی سے گزرتے ہوئے اندھیرے میں کھو جاتے تو وہ شور بھی دور ہوتا، گم ہوتا چلا جاتا۔ رکی ہوئی گاڑی میں جھٹکا لگتا، سارے ڈبے ہل اٹھتے، گاڑی پھر چل پڑتی۔

سفر میں امی نے کئی بار اپنی اکٹی آنکھ کے پھڑکنے کا ذکر بڑی فکرمندی سے کیا۔ سفر کے تیسرے دن صبح کو انہوں نے چلتی گاڑی سے سامنے کچے رستے پہ ایک بیل کو مرا پڑا دیکھا، بے ساختہ منہ سے نکلا "الٰہی خیر"۔ پھر گاڑی رک کے کھڑی ہو گئی۔ بس اس کے بعد تو ان کا سارا سفر ہی تشویش میں کٹا۔

باوا نے چلنے میں بہت جلدی کی تھی مگر ابا میاں نے ان سے زیادہ جلدی کی۔ پہنچے ہیں۔ تو بیجا تک ہو چکا تھا۔ بڑی آپا باوا سے مل کے بہت روئیں۔ روئیں، بین کئے اور بین میں ابا میاں کی طرف سے شکایتیں کیں کہ مرتے وقت باپ کو پانی نہیں پلایا۔ کبھی شکایت، کبھی طعنہ، کبھی ابا میاں کے انتظار کا ذکر، کبھی اپنی گھبراہٹ کا تذکرہ۔

آخری وقت تک دروازے پہ ٹکٹکی بندھی رہی۔ اب آؤ، اب آؤ۔ بار بار پوچھتے، چھموں گاڑی دیکھنے کسی کو بھیجا ہے۔ بڑی حسرت تھی کہ بیٹے کی صورت دیکھ لیں۔ بڑی آپا کی آواز پھر بھرا گئی اور باوا کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ رات کو جب وہ آکر اترے ہیں تو تڑکا ہو رہا تھا۔ بڑی آپا باوا کے گلے میں باہیں ڈال کے اور امی کے سر سے سر جوڑ کر جانے کب تک روتی رہیں۔ اس کی تو چارپائی پہ کمر لگاتے ہی پٹ سے آنکھ لگ گئی تھی۔ اب صبح اٹھنے پہ اسے لگا کہ رات کا وہ سلسلہ اب تک جاری ہے، ہاں اب اک ٹھہراؤ کے ساتھ بڑی آپا روتے روتے چپ ہو

جاتیں، باتیں کرنے لگتیں، ان کے ہاتھ میں سروطہ چلنے لگتا۔ پھر جانے کیا ہوتا کہ انہیں ابامیاں کی کوئی بات یاد آجاتی، آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، آواز رندھ جاتی اور قدرے اونچی آواز سے رونا شروع کر دیتیں۔ باوا چپ تھے، ہاں بار بار آنکھ ضرور نم ہو جاتی تھی، سر جھک جاتا تھا۔ آخری وقت میں ابامیاں کی صورت نہ دیکھنے اور خدمت نہ کرنے کا غم، پھر بڑی آپا کے بین بھرے طعنے، باوا کا سر جھک جاتا اور جیب سے رومال نکل کر آنکھوں پہ پہنچ جاتا۔ بڑی آپا کی آنکھوں کی طرح ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی تو نہیں تھیں مگر سرخ پڑ گئی تھیں۔

"بس ایک تمنا رہ گئی بی بی کہ بیٹا کہ کاندھا دے باقی تو خدا بخشے اللہ نے ساری تمنائیں پوری کیں"، تائی اماں کے لہجے میں تاسف کی کیفیت کے ساتھ ساتھ دلاسا دینے کا انداز بھی تھا۔ "اللہ، اولاد کو سب کچھ قابل بنا کے دنیا سے اُٹھے۔ ایسی سکھ کی نیند اللہ ہر کسی کو نصیب کرے"، تائی اماں کو جانے کیا دھیان آیا کہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگی تھیں۔ چپ بیٹھے بیٹھے آہستہ سے چونکیں، بولیں "بی بی بالکل ایسا لگے تھا کہ سوتے ہیں۔ جانو ابھی آنکھ لگی ہے اور ذرا کھٹکا ہوا تو چونک کے آنکھ کھول دیں گے۔"

بڑی آپا تائی اماں کا منہ تکنے لگیں۔ پھر کہیں اور جا پہنچیں "پوچھنے لگے کیا دن ہے۔ میں بولی جمعرات۔ پائنتی تحسینہ بیٹھی تھی، اسے تکنے لگے۔ بولے نادِ علی پڑھو میں نادِ علی پڑھنے لگی۔ ..... ایک ساتھ آنکھیں کھول دیں اور دروازے کو تکنے لگے ..... جیسے کوئی دروازے پہ کھڑا ہو ..... کہنے لگے چھموں ..... مولا آئے ہیں ..... پھر آنکھیں مندتی چلی گئیں ....."

سب چپ، اپنی اپنی جگہ بت بنے ہوئے، کسی دھیان میں ڈوبے ہوئے۔ وہ پھر بڑی آپا کو تکنے لگا تھا، جن کی آواز اب کی بار خلاف معمول بالکل نہیں بھرائی تھی۔

"آخری وقت میں مولا مشکل کشا آوے ہیں۔" تائی اماں کی دھیان میں ڈوبی ہوئی آواز سرگوشی جیسی کیفیت کے ساتھ اُبھری اور ڈوب گئی۔ پھر وہی چپ۔ آنگن کی ہر چیز ساکت تھی، دھوپ بھی کہ نیم کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی کی پائنتی پہ آکر رک گئی تھی۔

نیم کی کسی خاموش ٹہنی سے کوئی ننھا سا زردی مائل سفید پھول جھڑتا اور آہستہ سے کسی گود میں، کسی شانے پہ، کسی سر میں آپڑتا۔ ننھے ننھے زردی مائل سفید پھول خاموشی سے جھڑ رہے تھے اور بکھر رہے تھے، بڑی آپا کے گھٹنے پہ رکھے ہوئے سوکھے سر میں، تائی اماں کے سفید برف بالوں اور امی کی کھچڑی چٹیا میں، پاندان پہ، چارپائی پہ، چارپائی کے برابر بنی ہوئی گھڑونچی اور اس پہ رکھے ہوئے کورے سرخ گھڑوں پہ۔

جانے کیسے مگر پھر وہی ذکر چل نکلا، مگر اس مرتبہ سرگوشیوں میں۔ تائی اماں کی آواز اتنی آہستہ ہوتی کہ اسے کچھ سنائی نہ دیتا کہ کیا کہہ رہی ہیں، بس ہونٹ ہلتے اور ڈولا سی آنکھیں حیرت سے گردش کرتی اور باتیں کرتی دکھائی دیتیں اور بڑی آپا کے ہاتھ میں چلتا ہوا سروطہ یک بارگی رک جاتا۔

"اچھی بڑی آپا میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔" امی کی آواز سرگوشی کی حد سے نکل کر ذرا بلند ہو چلی تھی "میں نے تمہارے بھائی سے کہا۔ انہوں نے جھڑک دیا کہ تمہارا وسوسہ ہے۔ آبادی قریب ہے، کسی کسان کا بیل ہوگا، مر گیا۔ مگر آپا میرا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرے ہے۔ لنڈ گاڑی بیچ جنگل میں کیوں رکی اور آس پاس کوئی کھیت نہیں، کوئی گاؤں نہیں، بیل کس کا ہے۔"

"اری بہنوں"، بڑی آپا کے لہجے میں آواز بلند ہوتے ہوئے بھی سرگوشی کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں حیرانی "میں نے تو بہنوں، تین دن پہلے خواب دیکھ لیا تھا۔ کیا دیکھوں ہوں کہ ابا میاں ہیں، آواز دے رہے ہیں، چھموں، چھموں، میں دالان سے نکلی ہوئی۔ پشت ان کی میری طرف، باہر دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بولی ہوں کہ ابا میاں دلوں میں آپ کہاں جا رہے ہیں، کہہ رہے ہیں، بی بی، لوں کہاں، دن ڈھل رہا ہے، اذان ہو رہی ہے، نماز کو جاتا ہوں، دروازہ اندر سے بند کر لو۔"

پھر سب کے سب چپ تھے، اسی طرح اپنی اپنی جگہ بت بنے ہوئے ہیں، کسی دور کے دھیان میں ڈوبے ہوئے۔ نیم کی ٹہنیاں کہ دم بھر پہلے ہوا سے لہرا رہی تھیں سرنگوں ہو گئی تھیں